© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

آپ کو اس امر کا بارہا تجربہ ہوا ہوگا کہ جب کوئی شخص اپنی بات کو دلائل کے زور سے منوانے میں ناکام ہوتا ہے تو پھر وہ اس کے لیے کوئی خارجی سہارا تلاش کرتا ہے۔ ان سہاروں میں سے سب سے بڑا "وقت کا تقاضا" ہے۔ جب آپ لوگوں میں بیٹھ کر انہیں یہ باور کرانے لگیں کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ وقت کا عین تقاضا ہے تو اس سے فریقِ مخالف کے متعلق عام تاثر یہی پیدا ہوتا ہے کہ وہ کوتاہ بیں، تنگ نظر، متعصب اور ضدی شخص ہے جو اپنی جہالت کی وجہ سے فطرت کے خلاف نبرد آزما ہے اور آپ نہایت ہی روشن خیال اور حقیقت پسند ہیں جو حالات کی نبضوں پر ہاتھ رکھ کر صحیح صورتِ حال کو محسوس کر کے اس کے مطابق قدم اٹھا رہے ہیں۔ دورِ جدید میں افکار و نظریات کی دنیا میں جنگ کرنے کے لیے جو عجیب و غریب ہتھیار تیار کیے گئے ہیں ان میں سے یہ ہتھیار غالباً سب سے مؤثر ہے۔

ہمارے اس دور کا ہر مفکر جب بھی کوئی خیال پیش کرتا ہے تو اُسے آفاقی بنانے کے لیے سب سے پہلے اس امر کا التزام ضروری سمجھتا ہے کہ کسی طرح اسے تقاضائے وقت یا مطالبۂ فطرت ثابت کیا جائے۔ آپ ایسے مفکرین کے کسی نظریہ کا جائزہ لیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے نزدیک یہ منہ زور ابلقِ ایام اپنی ترنگ میں خود بخود سرپٹ دوڑتا چلا جا رہا ہے اور انسانیت اس کے ساتھ ہم عناں ہونے پر مجبور رہی ہے۔ دنیا کی کوئی قوت ایسی نہیں جو اس کا راستہ روک سکے جس طرح وقت کی لہروں پر کسی شخص کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا بالکل اسی طرح وقت کی اضطراری چال کے بارے میں انسان بالکل بے بس ہے۔ رہوارِ زمانہ افکار و نظریات کی جو گرد فضا میں پھیلا دیتا ہے انسان کے لیے اس سے کوئی مفر نہیں۔ وہ اُسے بڑھ کر اٹھا لینے پر مجبور ہے۔

آپ اپنے اردگرد پھیلے ہوئے مختلف نظریات کا تجزیہ کریں تو آپ کو اس کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ ان مغربی مفکرین نے غلطی سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ عقائد مابعد الطبیعی نظریات، اور زندگی کے عملی مسائل ایک خاص منزلِ مقصود کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں اور موجودہ حالت ماضی کی ساری حالتوں سے بہتر ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر آنے والی حالت موجودہ حالت سے لازمی طور پر ارفع و اعلیٰ ہو گی یا دوسرے لفظوں میں زمانہ اپنی قوت و طاقت سے بالکل میکانکی طور پر انسانوں کے اس گلہ کو ایک خاص سمت میں ہانک کرلے جا رہا ہے۔ مثال کے طور پر عہدِ قدیم میں انسانیت کے لیے "وقت کا تقاضا" یہ تھا کہ وہ قدرت کے رنگا رنگ مظاہر کو اپنے معبود سمجھ کر ان کے سامنے سرِ نیاز خم کرتی۔ اس کے بعد علم جس نسبت سے اس کی آنکھوں سے جہالت کا پردہ اٹھاتا چلا گیا اسی نسبت سے ان خداؤں کی تعداد کم ہوتی گئی اور اب جب کہ علمِ جدید کی روشنی نے آنکھوں کو چکاچوند کر دیا ہے تو انسان کو خدا کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ اب اہلِ مغرب کے نزدیک وقت کا اقتضا یہی ہے کہ معاذ اللہ خدا کو عہدِ جہالت کی ایک یادگار سمجھتے ہوئے اس کا لبادہ جلد از جلد اتار کر پھینک دیا جائے۔ چنانچہ مغربی مفکرین کا ایک طائفہ خدا کے متعلق اسی قسم کے افکار و خیالات پھیلا رہا ہے اور انہیں وقت کے تقاضے کے طور پر عوام کے سامنے پیش کرنے میں مصروف ہے اور ایسے روشن دماغوں کی بھی کمی نہیں جنہوں نے "فطرت کے اس اشارے" کو سمجھتے ہوئے اسے دل و جان سے قبول کر لیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مابعد الطبیعی نظریات کی رفعتوں سے نیچے اُتر کر اگر عملی زندگی کے مختلف مسائل پر غور کریں گے تو آپ کو ان میں بھی وقت کے عجیب و غریب تقاضے کار فرما نظر آئیں گے۔ یہاں ہم صرف اُس کی ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ انسانیت نے جس روز سے جنم لیا ہے اُس کے ہاں رشتۂ مناکحت ایک مقدس تعلق کے طور پر ہمیشہ سے موجود رہا ہے۔ اسی رشتہ پر خاندانی نظام کی بنیادیں استوار ہوئیں۔ مگر دَورِ جدید میں انسان نے یہ محسوس کیا ہے کہ عورت اور مرد کا باہمی تعلق کوئی روحانی اور قلبی تعلق نہیں بلکہ ان دونوں کی ایک حیاتیاتی جبلّت انہیں ایک دوسرے کے قریب ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ اس بنا پر نکاح کے بندھن بیکار کی زنجیریں ہیں جنہیں معاذ اللہ کم عقل لوگوں نے پہن رکھا تھا۔ "فطرت کا منشا" اسی قدر ہے کہ مرد اور عورت جب چاہیں اپنی اس صنفی خواہش کو پورا کر لیا کریں۔ اور اُن کی اس راہ میں کوئی چیز مزاحم نہ ہونے پائے۔ یہی نظریہ آج "فطرت کا اشارہ" بنا کر ہمارے سامنے لایا جا رہا ہے اور آج ہم اس مقدس رشتہ کی تعبیر کچھ اس طرح کر رہے ہیں کہ جیسے یہ رشتہ محض جہالت کی یادگار تھا۔ مثلاً ہمیں یہ سمجھایا جاتا ہے کہ عورت عہدِ قدیم ہی سے مظلوم چلی آ رہی ہے اور یہ ہمیشہ مرد کی ہوس کا شکار رہی ہے۔ پرانے وقتوں میں مرد کئی کئی ہزار عورتوں کو اپنے حرم میں ڈال لیا کرتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ جوں جوں علم نے ترقی کی ان کی تعداد کم ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ اب زمانہ نے اس کی آنکھوں پر سے جہالت کا پردہ اٹھا کر اس پر یہ حقیقت روشن کر دی ہے کہ نکاح کے بندھن جنہیں تم اتنا عزیز سمجھتے ہو یہ سب "فطرت کی تعزیریں" ہیں۔ انسان آزاد پیدا کیا گیا ہے اس لیے اُس کی خواہشات کے سامنے کسی چیز کو حائل نہ ہونا چاہیے۔

مغرب کی عیار اور چالاک قوموں نے جنہیں اس وقت دنیا کی سیادت اور قیادت حاصل ہے، افکار و نظریات کی دنیا میں بھی بڑی ہنرمندی اور چابکدستی کا ثبوت دیا ہے۔ انہوں نے جس طرح کمزور اقوام کو غلام بناتے ہوئے انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جو ظلم و ستم کر رہی ہیں، یا جس قسم کی لوٹ کھسوٹ انہوں نے مچا رکھی ہے وہ در اصل ان کی اپنی خواہش اور منشا کا نتیجہ نہیں بلکہ یہ سب کچھ فطرت کے اشارے کے عین مطابق ہو رہا ہے۔ اس لیے کمزوروں کو اس چیز پر قطعاً احتجاج نہ کرنا چاہیے کیونکہ ان کا یہ احتجاج فطرت کے خلاف احتجاج ہوگا جو کسی جہت سے بھی مناسب نہیں۔ فطرت بڑی طاقتور ہے اور اس کی مخالفت سے انسان اپنا ہی نقصان کرتا ہے اس لیے اُن کے لیے مناسب روش یہی ہے کہ وہ ان سارے مظالم کو خاموشی کے ساتھ برداشت کرتی رہیں۔ اگر آپ کو ہماری ان گزارشات پر یقین نہ ہو تو آپ تنازع للبقاء، انتخاب طبیعی اور بقاء اصلح جیسے باطل نظریات کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ کیا ان نظریات کے پیچھے یہی بنیادی تصوّر کارفرما نہیں کہ دنیا میں جو لوگ کمزور رہیں انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینا ہی فطرت کا اقتضا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے جو ظلم و ستم بھی کیا جائے وہی قدرت کا حقیقی منشا ہے۔ انہی تصورات کے تحت دنیا کی ہر ظالم اور مستبد قوم نے اپنے آپ کو "اصلح" سمجھتے ہوئے کمزوروں پر دست ظلم دراز کرنا شروع کیا۔ چنانچہ گذشتہ دو صدیوں میں مشرقی قوموں کے ساتھ جو انسانیت سوز سلوک روا رکھا گیا ہے وہ سب فطرت کے مطالبہ کے مطابق ہی تھا۔

بالکل یہی صورتِ حال افکار و تصورات کے معاملے میں بھی پیش آ رہی ہے۔ جن افکار و نظریات کو اس وقت یورپ میں قبولِ عام حاصل ہے وہی در حقیقت فطرت کے تقاضے بن کر مشرقی قوموں کے سامنے لائے جا رہے ہیں اور یہ سادہ لوح اقوام انہیں قدرت کے اشارے سمجھتے ہوئے ان پر بلا سوچے سمجھے رقص کر رہی ہیں۔ اُن کے دل و دماغ میں اس باطل تصوّر کو بٹھا دیا گیا ہے کہ دنیا میں جس نظریہ کا عام چلن ہو وہی در حقیقت سب سے صحیح بھی ہوتا ہے اور جو تصوّر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو جائے اس کا باطل ہونا ایک یقینی امر ہے۔ اپنی اس بات کو درست ثابت کرنے کے لیے لوگوں کو کچھ اس قسم کا تاثر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ زمانہ محض اپنی رفتار سے کچھ افکار و نظریات کو فروغ دیتا ہے جو وقت کا تقاضا ہوتے ہیں اور وہ خود ہی اپنی مصلحت کے تحت بعض افکار کو جو اُس کا ساتھ نہیں دے سکتے ۔ ۔ پیچھے دھکیل دیتا ہے۔ اس بنا پر کسی نظریہ کے حق و باطل ہونے کی اصلی کسوٹی محض رفتارِ زمانہ ہے۔ وقت کا قاضی جو فیصلہ دے دے وہی سو فی صدی درست ہے اور اس کے فیصلوں سے سرِ مُو انحراف کرنا فطرت کو چیلنج کرنا ہے۔

اس نظریے کو یورپ نے تنازع للبقا اور انتخابِ طبیعی کی طرح بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے اور اس کے پیچھے صرف یہی ایک جذبہ کارفرما ہے کہ جن افکار و نظریات پر اس وقت مغربی اقوام مٹی جا رہی ہیں انہیں وقت کے تقاضے کی بنا پر مشرقی قوموں کو قبول کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا جن نظریات کو اہلِ یورپ فطرت کے اشاروں سے تعبیر کر رہے ہیں وہ فطرت کے اشارے نہیں بلکہ مادہ پرست ذہن کے توہمات ہیں جنہیں مادی قوت و طاقت کے بل بوتے پر ساری دنیا کے دماغوں میں ٹھونسنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ مفروضہ ہی سرے سے باطل ہے کہ رہوارِ زمانہ محض اپنی رفتار سے کچھ ایسے تصورات اور نظریات سامنے لاتا ہے جو عین منشائے قدرت ہوتے ہیں اور جنہیں قبول کیے بغیر بن نہیں پڑتی۔ زمانہ گردش تو بلاشبہ کرتا ہے مگر یہ سمجھ لینا کہ وہی اپنی اس گردش کے ساتھ کچھ معتقدات اور کچھ تصورات کو بھی جنم دیتا ہے بہت بڑی حماقت ہے۔ زمانے کے اندر یہ صلاحیت ہی نہیں کہ وہ اپنے بطن سے کوئی نظریہ پیدا کر سکے۔ نظریات و تصورات خالقِ وقت کی لہریں نہیں بلکہ انسان کا دماغ ہے۔ ان لہروں میں البتہ یہ قوت ضرور موجود ہے کہ جو شخص یا قوم بھی اپنے دلپسند تصورات کو ان کی مدد سے دنیا میں پھیلانا چاہے۔ یہ فوراً اپنا دستِ تعاون اس کی طرف بڑھا دیتی ہیں۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ لاتعداد توہمات کی طرح وقت کا تقاضا بھی محض ایک واہمہ ہے اور جو شخص

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کسی نظریہ کو وقت کا تقاضا سمجھ کر اس کے سامنے سرنگوں ہونے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے وہ کسی حقیقت کو تسلیم کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ نہیں کرتا بلکہ صرف ایک وہم یا خیال کی اندھی عقیدت میں گرفتار ہو جاتا ہے اور یہ طرزِ فکر وہی لوگ اختیار کرتے ہیں جن کے دل و دماغ کسی دور کے تہذیبی رجحانات سے مرعوب ہی نہیں بلکہ مغلوب بھی ہوتے ہیں۔ یہ اندازِ فکر احساسِ کہتری کا مظہر ہے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ دنیا کے باہمت لوگوں نے اپنی قوتِ فکر و عمل سے وقت کے دھاروں کو بدل کر رکھ دیا اور اپنی سعی و جہد سے اس حقیقت کو ثابت کر دکھایا کہ انسانی تاریخ میں جبر کا کوئی ایسا عنصر نہیں پایا جاتا جو نوعِ بشری کو مجبوراً کسی خاص سمت میں ہانک کر لے جائے۔ دنیا کے جس نظریہ کے لیے خواہ وہ حق ہو یا باطل منظم کوشش کی گئی اور اس کو ماننے والوں نے اس کے لیے جان و مال کی قربانی، تنظیم، مرکزیت اور فہم و تدبر کا ثبوت دیا وہی نظریہ دنیا میں غالب ہو کر وقت کا تقاضا بن کر سامنے آیا۔ واقعات کے دھارے لیل و نہار کی گردشوں کے ساتھ نہیں بدلتے بلکہ انسانوں کی ذہنی اور عملی قوتیں انہیں اپنے عزم سے تبدیل کرتی رہتی ہیں۔

دنیا میں آج تک جتنی انقلابی طاقتیں ابھری ہیں انہوں نے اپنے اپنے دور کے تہذیبی اثرات کے خلاف بغاوت کر کے ہی انسانیت کے فکر و عمل کے سانچوں کو بدلا اور نئے انقلاب کے لیے راستہ ہموار کیا ہے۔ اگر وہ لوگ اپنے دور کے غالب نظریات کو فطرت کے اشارے سمجھتے ہوتے ان کے سامنے بالکل بے دست و پا ہو کر بیٹھ جاتے تو انسانیت کسی انقلاب سے آشنا نہ ہو سکتی۔ حضور سرورِ کائنات جس وقت دنیا میں تشریف لائے تو اس وقت یہودیوں اور عیسائیوں کا غلبہ تھا۔ قوت و طاقت اور مال و متاع پر یہی لوگ قابض تھے۔ ان حالات میں وقت کا تقاضا یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان میں سے کسی کی حمایت حاصل کرتے مگر حضور سرورِ دو عالم نے وقت کے تقاضے کی قطعاً پروا نہ کی آپؐ نے حضرت مسیح علیہ السلام اور ان کی والدہ محترمہ حضرت مریم صدیقہ کی تعریف فرما کر یہودیوں کی ناراضگی مول لے لی اور حضرت مسیح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علیہ السلام کی ابنیت اور اُلوہیت کا انکار کر کے عیسائیوں کو برہم کر دیا۔ غور کیجیے اگر وقت کا تقاضا کوئی قابلِ التفات چیز ہوتی تو کیا حضورؐ ایسے ہی کرتے کہ وقت کے غالب رجحانات میں سے کسی کا بھی ساتھ نہ دیکر سب کو اپنا دشمن بنا لیتے۔ اگر اُس دور کے تہذیبی رجحانات کے سامنے سرنگوں ہونے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہ تھا تو پھر ایسی فضا میں اسلامی اقدارِ حیات کو دنیا میں کس طرح فروغ حاصل ہوا اور دیکھتے دیکھتے کیسے یہ دنیا کی غالب اقدار بن گئیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد حضورؐ کے جلیل القدر رفقائے کار کو بھی کئی مرتبہ "وقت کے تقاضوں" نے مداہنت سے کام لینے کی دعوت دی مگر انہوں نے اس طرزِ عمل کو اختیار کرنے کے بجائے حق پرستی کی راہ کو ہی اپنے لیے منتخب کیا۔ اس معاملے میں سب سے پہلی الجھن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ پیش آئی کہ مسلمانوں کے ایک باثر گروہ نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا۔ ان پرآشوب حالات میں وقت کا تقاضا یہی تھا کہ ان لوگوں کی اس حرکت سے اغماض برتا جاتا اور انہیں ساتھ ملا کر مرتدین کے خلاف ایک زبردست محاذ قائم کیا جاتا مگر صدیق اکبرؓ نے وقتی مصلحتوں سے یکسر صرفِ نظر کیا اور بڑے عزم کے ساتھ فرمایا: "واللہ! میں صلوٰۃ اور زکوٰۃ میں فرق کرنے والے لوگوں سے ضرور لڑوں گا۔ کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے اور رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ اسلام قبول کرنے والے لوگوں کے ذمے جو حقوق ہوں گے ان کی ادائیگی کا مطالبہ ان سے بہر حال کیا جائے۔

یہ ایک دو واقعات ہم نے صرف وقت کے تقاضوں کی اصل حقیقت واضح کرنے کے لیے بیان کیے ہیں ورنہ دنیا کی ہر زندہ قوم کی تاریخ اور اس لحاظ سے امتِ مسلمہ کا سارا تاریخی سرمایہ اس بات پر گواہ ہے کہ وہ قومیں جو اس کرۂ ارضی میں اپنے معین مقاصد رکھتی ہیں اور پھر ان کے اندر ان مقاصد کو غالب کرنے کا داعیہ بھی کارفرما ہوتا ہے۔ وہ کبھی بھی اپنے آپ کو ان اوہام میں گرفتار نہیں ہونے دیتیں کہ وہ زمانے کے ہاتھوں بے بس ہیں۔

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

© rasailojaraid.com